دوسری تاریخ کانفرنس

لاہور شہر تاریخ کے آئینے میں

بلال احمد

یہ خوشی کی بات ہے کہ ملکی سیاسی حالات کی پیچیدگی کے باوجود جناب ڈاکٹر مبارک علی اس سال بھی وعدہ کے مطابق تاریخ کانفرس کے انعقاد میں کامیاب رہے۔ ارادہ تو یہ تھا کہ اس سال جنوبی ایشیا کے دیگر ممالک سے بھی مورخین کو مقالے پڑھنے کے لئے مدعو کیا جائے گا مگر ۱۱ ستمبر کے واقعات اور افغانستان کے حالات کے باعث غیر ملکی مہمانوں نے شمولیت سے معذرت کر لی۔ اس سے پہلے کہ کانفرنس میں پڑھے گئے مقالوں کے بارے کچھ بات کی جائے حالیہ کانفرنس کی ایک مثبت پیش رفت کا ذکر ضروری ہے۔ کانفرنس کے اختتام پر جناب ندیم عمر نے بتایا کہ تاریخ اور کلچر کے نام سے ایک مستقل انسٹیٹیوٹ کی جانب پیش رفت ہو رہی ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے مقاصد بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس ادارے کے تحت ملک میں تاریخ و کلچر کے موضوعات پر سنجیدہ علمی تحقیق کو فروغ دیا جائے گا، نیز انسٹیٹیوٹ کے تحت وہ طالب علم یا محققین جو کسی معاشی مجبوری یا مناسب رہنمائی کی عدم دستیابی کی وجہ سے یکسوئی سے تحقیقی کام نہیں کر پاتے کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ہر ممکن عملی راہ نمائی اور مدد فراہم کی جائے گی۔ ملک میں تحقیق کی سہولیات کی روز بروز کم ہوتی ہوئی فضا اور سہولیات کے پیش نظر سنجیدہ محققین کو ملک سے باہر رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ملک میں ایسے اداروں کی اشد ضرورت ہے جو محققین کی تحقیق میں معاونت کر سکیں تاکہ سنجیدہ علمی کاوشوں میں دلچسپی رکھنے والوں کو مجبوراً ملک سے باہر نہ جانا پڑے اور وہ ملک میں رہتے ہوئے ہی اپنا کام جاری رکھ سکیں۔

اس سال کی کانفرنس کا موضع لاہور کی تاریخ تھا۔ کانفرنس کے سلسلے میں جناب ڈاکٹر مبارک علی، جناب مسعود الحسن، جناب غافر شہزاد، جناب ڈاکٹر پرویز وندل، جناب ڈاکٹر انیس عالم، جناب سجاد کوثر اور جناب ندیم عمر نے مقالے پڑھے۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر مبارک علی نے پڑھا۔ مقالے کا موضع تھا شہر، تاریخ، کلچر اور اقتصادیات"۔ ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے کہ شہر تہذیب کی پیداوار میں معاونت کرتے، اسے پروان چڑھاتے اور بسا اوقات تہذیبی تنزلی کے ساتھ ہی زوال پزیر ہو جاتے ہیں۔ تاہم چند شہر ایسے بھی ہیں جو تہذیب کے عروج و زوال کے باوجود قائم رہ جاتے ہیں۔ لاہور انہی شہروں میں سے ایک ہے جنہوں نے زمانے کے متعدد نشیب و فراز دیکھے اور قائم رہے۔ مورخین کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ شہروں کی تاریخ ہی دنیا کی تاریخ ہوتی ہے۔ شہر اور دیہات کے تضادات کا ذکر کرتے ہوئے جناب مبارک علی نے کہا کہ شہروں اور دیہاتوں میں ہمیشہ تضاد رہا ہے۔ بالعموم تصور یہی ہے کہ شہروں کی زندگی بد عنوان اور گناہ آلودہ ہوتی ہے، جب کہ دیہات سادگی اور خالص پن کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ شہر کے بارے منفی رائے کے باوجود اس کی کشش کا اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب کوئی شہر میں بس جائے تو وہ واپس گاؤں جانے کی بجائے فٹ پاتھ پر مرنا قبول کر لیتا ہے۔

اسلامی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے جناب مبارک علی نے بتایا کہ شام اور عراق کی فتح کے بعد مسلمانوں نے بزنطانی شہروں کو ہی اپنے سیاسی اور اقتصادی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اپنی حاکمیت کا دبدبہ قائم کرنے کے لئے انہوں نے ان شہروں کے گرجوں کو گرا کر وہاں مساجد بنوائیں۔ مسلمانوں کے شہروں میں تین طرح کی عمارات یعنی جامع مسجد، خانقاہ اور قلعہ طاقت کی علامت سمجھی جاتی تھیں۔ یہ عمارات شریعت، طریقت، اور سیاسی قوت کی علامت سمجھی جاتی تھیں۔ بھارت میں مغلوں اور سلطانوں نے شودروں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کو بھی شہروں میں بسنے کی اجازت دے کر شہر کی ساخت بدل کر رکھ دی۔ اس تبدیلی کو ہندوستانی تاریخ میں شہری انقلاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے تمام برصغیر میں نئے شہروں کو آباد کیا جو، صنعت و حرفت، تجارت، اور علوم و فنون کے مراکز بنے۔ شہر میں کوتوال کے دفتر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے جو کہ امن عامہ کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح میر محلّہ کے نام سے سرکاری کارندہ ہوا کرتا تھا جس کا کام اپنے علاقے کے لوگوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور شام کو شہر کے بڑے دروازے بند کرنا ہوتا تھا۔ پانی کی فراہمی ایک بڑے ٹینک کے ذریعے کی جاتی تھی جسے حوض کہا جاتا تھا۔ جب کے بازار کا نظم و نسق محتسب کی ذمہ داری ہوتی تھی جو تاجروں پر نظر رکھتا اور بد دیانت کاروباریوں کو شہر سے نکالنے کا اختیار رکھتا تھا۔ لاہور کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ۱۸۵۷ء کے فسادات کے

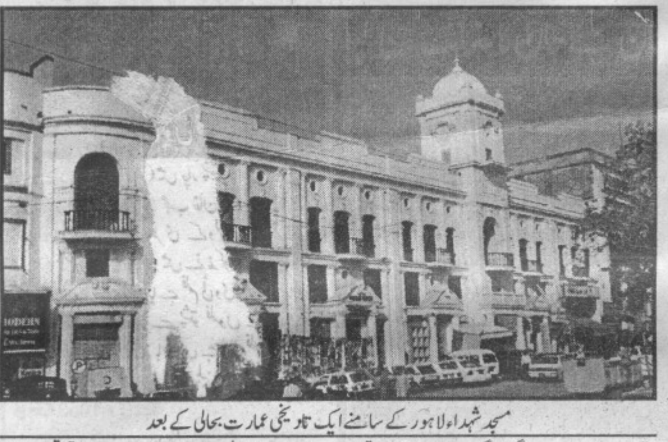

مسجد شہداء لاہور کے سامنے ایک تاریخی عمارت بحالی کے بعد

نتیجے میں جب دلی برباد ہو گئی تو انگریزوں نے نو آبادیاتی دور میں لاہور کو علم و فن کا مرکز بنا دیا جس کے نتیجے میں لاہور دلی کے متبادل کے طور پھر سے ترقی کرنے لگا۔

کانفرنس کے سلسلے کا دوسرا مقالہ جناب مسعود الحسن نے پڑھا جو کہ جی ڈی گولڈن کے مضمون کا ترجمہ تھا۔ اس مقالے میں تیرھویں اور چودھویں صدی کے لاہور کا تذکرہ ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لاہور اہم دفاعی راستے پر ہونے کی وجہ سے شمالی ہندوستان کے لئے ہمیشہ اہم رہا ہے۔ مضمون میں لاہور پر قبضے کے حوالے سے متعدد جنگوں مثلاً، غزنوی، خوارزمی، بلبن اور منگولوں کی باہمی چپقلشوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ مضمون نگار کے مطابق بارہویں صدی کی آرمینیائی دستاویزات سے اندازہ ہوتا ہے کہ لاہور اپنے زمانے کا بڑا کاروباری مرکز تھا۔ لاہور کے اکثر باشندے تجارت سے وابستہ تھے جو خراسان اور ترکستان تک سفر کیا کرتے تھے اور جن کے گجرات کے ہندو تاجروں سے بھی گہرے مراسم تھے۔ البتہ اس شہر کے قرب وجوار میں بسنے والے کھوکھر، اعوان، اور جنجوعہ قبائل شہر کا امن برباد کرتے رہتے تھے اس لئے لاہور ملتان جیسی اہمیت کبھی اختیار نہ کر پایا۔ چودھویں صدی کے وسط میں کھوکھروں نے لاہور کے گورنر کو قتل کر دیا جس سے ایک دفعہ پھر تجارتی راستے بند ہو گئے اور یوں تیموروں کے حملے سے قبل لاہور کم تر حیثیت اختیار کر گیا۔

کانفرنس کے سلسلے کا تیسرا مقالہ "بدلتے معاشرتی تناظر میں گھر کی اہمیت" جناب غافر شہزاد نے پڑھا۔ اس دلچسپ مقالے میں لاہور شہر میں تاریخ کے مختلف ادوار میں گھروں کی تعمیر میں آنے والی تبدیلیوں پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ غافر شہزاد ہمیں بتاتے ہیں کہ ٹھوس شواہد کی عدم موجودگی کے باعث قیاس یہ ہے کہ لاہور تقریباً ایک ہزار سال پہلے آباد ہو چکا تھا۔ پیک کی تحقیق Walled City of Lahore کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ابتدائی لاہور کی آبادی لنگا منڈی جسے اب گمٹی بازار کہا جاتا ہے کے آس پاس رہا کرتی تھی۔ پرانے وقتوں میں لاہور کے گھروں کا پھیلاؤ افقی کی بجائے عمودی ہوا کرتا تھا۔ گھر ایک دوسرے سے جڑے ہوتے تھے جن کے درمیان تنگ گلیاں گزرتی تھیں۔ اکبر کے زمانے میں شہر کو چھتیس حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ جن میں سے نو گزریں شہر کے اندر تھیں اور باقی فصیل کے نواح میں۔ یہ گزریں ہی شہر کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتی تھیں۔ پرانے گھروں کی طرز تعمیر میں مکان کے شروع ہی میں زینہ بالائی منزلوں کو جاتا ہے۔ اس جگہ کو ڈیوڑھی کہا جاتا ہے۔ اس دور کے گھروں میں بیرونی صحن کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا، بلکہ اندر کی طرف ایک صحن ہوتا ہے جس کے چاروں طرف کمرے ہوتے ہیں۔ کمروں کے بارے بھی کوئی تخصیص نہیں کہ جاتی تھی کہ کون سا کمرہ کس مقصد کے لئے ہے۔ تمام کمروں کے دروازے اندر کی طرف صحن میں کھلتے تھے۔ زیادہ تر گھروں میں زیریں منزلیں صرف بیٹھک کا کام دیا کرتی تھیں جہاں صرف مرد بیٹھا کرتے تھے اور عورتیں بالائی منزلوں پر رہا کرتی تھیں۔ ہر گھر تین اطراف سے ہمسائے کے مکان سے جڑا ہوتا تھا جب کہ ایک سمت کھلی رکھی جاتی تھی جہاں سے روشنی اور ہوا کا حصول ممکن تھا۔ گھر کی تعمیر تمام قطعہ اراضی پر کی جاتی تھی اور کسی طرف سے بھی کوئی خالی جگہ چھوڑنے کا رواج نہیں تھا۔ گھروں کے سامنے گزرنے والی گلی مشترکہ ملکیت تصور کی جاتی تھی۔ گھر کی چھت کا اپنا ایک مقام تھا جہاں ایک برساتی کا رواج تھا جو تین اطراف سے بند اور ایک طرف سے کھلی ہوا کرتی تھی۔ گلی کی طرف ایک شاہ نشین بھی ہوا کرتا تھا جس پر گرمیوں میں شام کو ہوا خوری اور سردیوں میں دھوپ تاپنے کے لئے افراد خانہ جمع ہوتے تھے۔ چھت کے علاوہ جھروکا یا بالکونی ایک ایسا حصہ تھا جسے خواتین ہمسائی سے سماجی تعلقات پیدا کرنے کے استعمال کیا کرتی تھیں اور جو گھر کے جمالیاتی حسن میں اضافے کا باعث بھی ہوتا تھا۔

سکھوں کے دور حکومت تک گھروں کی تعمیر اندرون شہر تک ہی مرکوز تھی۔ البتہ انگریزوں نے جب لاہور پر قبضہ کیا تو فوجی چھاؤنی کی ضرورت محسوس کی گئی جسے شہر سے متصل کرنے کے لئے ٹھنڈی سڑک کی تعمیر کی گئی۔ اسی طرح اندرون شہر سے باہر، نئی عمارات تعمیر کی گئیں جن میں، ٹولنٹن مارکیٹ، تار گھر، جی پی او، چیف کورٹس، عجاب گھر، پنجاب یونیورسٹی وغیرہ زیادہ قابل ذکر ہیں۔ انگریزی دور میں پرانے شہر سے باہر مسلمانوں کے لئے اسلامیہ پارک، فاروق گنج، گڑھی شاہو، محمد نگر آباد کئے گئے تو ھندوؤں اور سکھوں کے لئے گوال منڈی، کرشن نگر، شام نگر، اور سنت نگر جیسی بستیاں بسائی گئیں۔ ان بستیوں میں پانی، نکاسی آب، اور بجلی کی سپلائی کے لئے ضروری تھا کہ گلیاں سیدھی اور کشادہ بنائی جائیں۔ گرمی کی حدت سے بچاؤ کے لئے چھتوں کو اونچا رکھنا اور برآمدے کا رواج انگریزی دور میں شروع ہوا۔ اس دور میں پلاٹ کا رقبہ مربع شکل کا ہو گیا تاکہ چاروں طرف کھڑکیوں کو ہوا کے لئے کھولا جا سکے۔ لکڑی کے علاوہ لوہے کی ریلنگ کا روج بھی عام ہوا اور دیگر کمروں کے ساتھ ایک ٹائلٹ کا اضافہ ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جن آبادیوں کے اضافے ہوئے ان میں ترقیاتی کام پہلے کئے گئے۔ گلیوں اور پلاٹوں کی حد بندی میونسپل کمیٹی کے ذمہ ہو گئی۔ ۱۹۱۷ میں لندن میں خوف ناک آگ بھڑک اٹھی جس کے بعد گھروں کی دیواریں ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا قانون پاس کیا گیا تاکہ ایک گھر کو آگ لگنے کی صورت میں تمام علاقے میں آگ نہ پھیل سکے۔ (جاری ہے)